لا الٰہ الا اللہ (ایک بار) ۔ مالکیوں کے نزدیک اقامۃ اس طرح کہی جاتی ہے : اللہ اکبر (دو بار)، اشہد ان لا الٰہ الا اللہ (ایک بار)، اشہد ان محمداً رسول اللہ (ایک بار)، حی علی الصلوۃ (ایک بار)، اللہ اکبر (دو بار)، لا الٰہ الا اللہ (ایک بار) ۔ اکیلے نماز پڑھنے والے کے لیے بھی کتب فقہ میں اقامۃ کا کہنا سنت قرار دیا گیا ہے (کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، مصر ۱۹۵۰ء، ۱ : ۲۳۵) ۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ اسلام میں اقامۃ کا تصور یہود کی نماز سے لیا گیا ہے اور اس کے لیے انہوں نے المقریزی، ۲ : ۲۷۱، کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ حوالہ غیر متعلق ہے اور ان مستشرقین کا یہ خیال درست نہیں جس کے لیے دیکھیے بخاری : صحیح، کتاب الاذان، باب ۱ ; احمد : مسند، ۴ : ۴۲ ببعد ; جہاں آغاز اذان کی بحث ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح یہ کلمات یہود، نصاری اور مجوس کے طریق کے خلاف اور اسے چھوڑتے ہوئے اختیار کیے گئے : نیز دیکھیے وؔ عربی، ۲ : ۳۰۰، تعلیقہ از محمد عرفہ ۔

مآخذ : (۱) احادیث کے مجموعوں اور فقہ کی کتابوں کے علاوہ دیکھیے : (۱) الدمشقی : رحمۃ الامۃ فی اختلاف الأئمۃ (بولاق ۱۳۰۰ھ) ص ۱۳ ببعد ; (۲) باجوری (بولاق ۱۳۰۷ھ)، ۱ : ۱۶۷ ۔

(عبدالمنان عمر)

⊘ **اقبال** : ڈاکٹر شیخ محمد اقبالؒ ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء / ۲۰ ذوالحجہ ۱۲۸۹ھ کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے (بلدیۂ سیالکوٹ کے اندراجاتِ پیدائش و اموات، شائع کردۂ روزنامۂ انقلاب مورخۂ ۷ مئی ۱۹۳۸ء) [اور فقیر سید وحید الدین کی رائے میں ۳ ذوالقعدہ ۱۲۹۴ھ / ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو، دیکھیے روزگار فقیر، طبع دوم، ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۷] ۔ آبا و اجداد "سپرو" گوت کے کشمیری پنڈت تھے، جو غالباً اٹھارھویں صدی کے اوائل میں حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے (مشاہیر کشمیر، ص ۱۷۷)، تجارت کے سلسلے میں پنجاب آتے اور واپس چلے جاتے تھے ۔ دادا مستقل طور پر سیالکوٹ میں سکونت پذیر ہو گئے ; ساٹھ سال کی عمر میں ہیضے سے روپڑ میں وفات پائی، جہاں ان کے چھوٹے بیٹے (اقبال کے عمِ محترم) ملازم تھے ۔

اقبال کے والد بزرگوار شیخ نور محمد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن دقیقہ سنجی اور فہمِ حقائق میں ایسی دسترس حاصل تھی کہ شمس العلماء مولانا میر حسن سیالکوٹی جیسے فاضلِ اجلّ نے انہیں ان پڑھ فلسفی کا خطاب دے رکھا تھا ۔ وہ دستکاری سے روزی کماتے تھے اور بہ لحاظ معاش فارغ البال نہ تھے، لیکن کردار نہایت پاکیزہ اور مزاج صوفیانہ تھا، جس کی وجہ سے اہلِ شہر ان کی بہت عزت کرتے تھے ۔

اقبال نے خود لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک فقیر ہمارے دروازے پر آ کر اڑ گیا ۔ میں نے اس کے سر پر ایک ضرب لگائی ۔ جو کچھ اس نے بھیک مانگ کر جمع کر رکھا تھا گر پڑا ۔ یہ دیکھتے ہی والد تڑپ اٹھے، آنکھیں نمناک ہو گئیں، فرمایا : قیامت کے دن خیر الرسلؐ کی امت کے غازی، شہید، عالم، زاہد، عاشق جمع ہوں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مجھ سے پوچھیں گے کہ ایک جوان مسلمان تیرے حوالے ہوا تھا، جسے میری تعلیم سے کچھ حاصل نہ ہوا ; تو مٹھی بھر خاک کو آدمیت کے اوصاف نہ سکھا سکا ۔ بتا ! میں کیا جواب دوں گا ؟ (رموز بیخودی، طبع اوّل، ص ۷۱ تا ۷۳) ۔

اقبال جب موقع پاتے والد کی خدمت میں پہنچ جاتے ۔ گرمیاں پہاڑ پر بسر کرنے کے بجائے ان کی گرمی صحبت سے مستفید ہوتے ۔ فرماتے ہیں

ایک مرتبہ شام کا کھانا کھا رہے تھے، ایک متوفی عزیز کا ذکر آ گیا۔ دورانِ گفتگو میں کہنے لگے: ''معلوم نہیں بندہ اپنے رب سے کب بچھڑا ہوا ہے''؟ اس خیال سے اس قدر متأثر ہوئے کہ تقریباً بے ہوش ہو گئے۔ رات کے دس گیارہ بجے تک یہی کیفیت رہی (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۹۷).

اقبال کی پیدائش سے پیشتر آپ کے والد ایک ڈپٹی کے ہاں ملازم ہو گئے تھے، جن پر رشوت ستانی کا شبہ تھا۔ والدہ نے بطور خود حلف اٹھا لیا کہ ملازمت کی آمدنی سے کھانے پینے کی کوئی شے نہ خریدیں گی؛ چنانچہ اقبال کی شیرخوارگی کے زمانے سے والد کی تنخواہ سے خریدی ہوئی کوئی چیز نہ دس سال کی عمر تک اقبال کو کھانے دی نہ خود کھائی، یہاں تک کہ والد نے ڈپٹی کی ملازمت ترک کر دی.

عرفان و تقوٰی اور آدابِ اسلامیت کی یہ پُر سعادت فضا تھی جس کی آغوش میں اقبال نے تربیت پائی اور اس تربیت سے ان کے خداداد جوہر چمک اٹھے۔

دو بھائیوں اور چار بہنوں میں اقبال سب سے چھوٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں شروع ہوئی۔ پھر سکاچ مشن سکول میں داخل ہو گئے۔ پرائمری، مڈل اور میٹرک کے امتحانوں میں وظیفہ حاصل کیا۔ ایف۔ اے کا امتحان سکاچ مشن کالج سیالکوٹ سے پاس کر کے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ بی۔ اے کے سالانہ امتحان میں انگریزی اور عربی کے لیے دو طلائی تمغے ملے۔ عربی کے امتحان میں پنجاب بھر میں اول رہے۔ ۱۸۹۹ء میں ایم۔ اے (فلسفہ) کا امتحان پاس کیا اور تمغہ پایا.

مولانا میر حسن اقبال کے والد کے ہم محلّہ اور عزیز دوست تھے۔ وہ پہلے سکاچ مشن سکول میں عربی اور فارسی کے استاد تھے۔ پھر کالج کے پروفیسر بن گئے۔ عربی اور فارسی میں اپنے عہد کے یگانہ عالم مانے جاتے تھے۔ اقبال کو جوہرِ قابل دیکھ کر مولانا نے تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرمائی اور اقبال نے بھی اس تربیت سے انتہائی فائدہ اٹھایا، جس کا اعتراف ان کی ایک نظم میں موجود ہے (بانگ درا، ص ۹۸ - ۹۹)۔ حالی نے سرسیّد کی تاریخ وفات کے سلسلے میں دو عجیب و غریب عربی مادوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک غُفِرلَہٗ۔ دوسرا اِنّی مُتوفّیک و رَافِعُکَ اِلیَّ و مُطَہِّرُک (حیاتِ جاوید، حصۂ اول، ۳۰۵)۔ ان میں سے پہلا مادّہ مولانا میر حسن نے اور دوسرا اقبال نے نکالا تھا (روایات، جمع کردۂ راقم)۔ اس شفیق استاد سے اقبال کی غیر معمولی عقیدت برابر قائم رہی، یہاں تک کہ جب خود ان کے لیے ''سر'' کا خطاب تجویز ہوا تو حکومت سے کہہ کر مولانا کو ''شمس العلما'' کا خطاب دلایا.

گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کا خاص تعلّق پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، استادِ فلسفہ، سے پیدا ہوا، جو عربی کے فاضل تھے اور اپنی کتاب *Preaching of Islam* کے باعث شہرۂ آفاق ہیں۔ وہ اقبال کے متعلّق کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کا معیارِ فکر بلند کر دیتا ہے۔ اس شفیق استاد کے متعلّق اقبال کے عقیدت بھرے جذبات نے ''نالۂ فراق'' (بانگِ درا) کی شکل میں بقائے دوام کا لباس پہنا.

ایم۔ اے کرنے کے بعد اقبال ۱۸۹۹ء میں اورینٹل کالج لاہور میں [بطور میکلوڈ عریبک سکالر (ریڈر) مقرر ہوئے۔ اس دوران میں عارضی طور پر اسلامیہ کالج اور گورنمنٹ کالج میں انگریزی اور فلسفے کے استاد بھی رہے۔] اسی زمانے میں اقبال نے علم الاقتصاد پر ایک کتاب لکھی، جو [ان کے اپنے قول کے مطابق] اس مضمون پر ''اردو میں سب سے مستند کتاب تھی'' (مکتوب اقبال، در شاد اقبال، ص ۳۵)-

[اس زمانے میں انھوں نے اور بھی علمی کام کیا (ملاحظہ ہو مجلۂ اقبال، اپریل ۱۹۹۲ء، مضمون از ڈاکٹر غلام حسین، ص ۵۲) - یہ ریڈر شپ ۱۲ مئی ۱۹۰۳ء تک رہی - اس کے بعد وہ دوبارہ ۳ جون ۱۹۰۳ء کو گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے - ۱۹۰۵ء میں تین سال کی رخصت لے کر انگلستان چلے گئے]۔

۱۸۹۵ء میں حکیم امین الدین بیرسٹر کے مکان (بازارِ حکیماں، اندرون بھاٹی دروازہ) پر ایک مشاعرے کی طرح ڈالی گئی - دہلی کے مرزا ارشد گورگانی اور لکھنؤ کے میر ناظر حسین ناظم اس مشاعرے کی روح و رواں تھے - یہ دونوں صاحب اور ان کے شاگرد ایک دوسرے کے مقابلے میں طبع آزمائیاں کیا کرتے تھے - اس مشاعرے کی ایک مجلس میں اقبال نے طرحی غزل پڑھی، جس کے مندرجۂ ذیل شعر پر مرزا ارشد تڑپ اٹھے :

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

مقطع میں دہلی اور لکھنؤ کے جھگڑوں پر یہ حقیقت آموز تبصرہ کیا گیا تھا :

اقبال لکھنؤ سے نہ دلّی سے ہے غرض
ہم تو اسیر ہیں خمِ زلفِ کمال کے

(تفصیل کے لیے دیکھیے حکیم احمد شجاع : لاہور کا چیلسی، در نقوش، لاہور).

مقامِ مشاعرہ کے سامنے حکیم شہباز دین کا مکان تھا - موصوف کے خصائل حسنہ کے باعث یہ گویا بامذاق اصحاب کا کعبہ تھا - چند روز میں اقبال بھی اس حلقۂ احباب کے رکن بن گئے - انہیں احباب کے اصرار پر اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے لیے اپنی پہلی مشہور نظم ''نالۂ یتیم'' لکھی، جو ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو انجمن کے اجلاس میں نمازِ عصر کے بعد پڑھی گئی - یہ اگرچہ بانگ درا میں شامل نہ کی گئی۔ لیکن اپنے اچھوتے انداز اور کمال سوز و اثر کے باعث اس درجہ مقبول ہوئی کہ اجلاس میں یتیموں کی امداد کے لیے روپوں کی بارش ہونے لگی، آنسوؤں کے دریا بہہ گئے اور نظم کی ایک ایک مطبوعہ کاپی چار چار روپے میں فروخت ہوئی (اقبال پر ایک نظر، ص ۴) - شمس العلماء مولانا نذیر احمد صدر اجلاس نے فرمایا : ''اگرچہ میں نے دبیر اور انیس کی بہت سی نظمیں سنی ہیں مگر واقعی ایسی دل شگاف نظم کبھی نہیں سنی'' (حمایتِ اسلام، انجمن کا ماہانہ رسالہ، بابت مارچ ۱۹۰۰ء، ص ۳۶) .

اقبال کی نظمیں انجمن کے سالانہ جلسوں کی ایک امتیازی خصوصیت بن گئیں : چنانچہ ۱۹۰۱ء میں ''یتیم کا خطاب ہلالِ عید سے''، ۱۹۰۲ء میں ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے''، ۱۹۰۳ء میں ''فریاد امت بہ حضور سرور کائنات'' موسوم بہ ''ابرِ گوہر بار'' اور ۱۹۰۴ء میں ''تصویرِ درد'' پڑھی گئیں - یکم اپریل ۱۹۰۱ء سے مخزن کا اجراء ہوا اور اس میں اقبال کی نظم ''ہمالہ'' چھپی - اس کے ساتھ ہی نئے انداز کی نظموں اور غزلوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہو گیا - یوں انجمن کے جلسوں اور مخزن کے صفحات کے ذریعے اقبال شعرائے ہند کی صفِ اوّل میں ممتاز مقام پر فائز ہو گئے .

اگست ۱۹۰۵ء میں وہ ولایت گئے اور تین سال وہاں گزارے - فلسفے میں اعلیٰ‌ترین امتحان کیمبرج (انگلستان) اور میونخ (جرمنی) کی یونیورسٹیوں سے پاس کیے - پی.ایچ.ڈی کے لیے جو مقالہ لکھا تھا وہ *Development of Metaphysics in Persia* (''ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا'') کے نام سے کتابی صورت میں چھپ گیا - چھ ماہ کے لیے لنڈن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کی جگہ عربی

کے پروفیسر رہے ۔ کیکسٹن ہال میں اسلام پر ایک لیکچر دیا، جو تمام مشہور اخباروں میں لفظ بہ لفظ شائع ہوا ۔ وہیں مارچ ۱۹۰۷ء میں ایک نظم لکھی، جس میں یورپی تہذیب کی بے اساسی کے علاوہ اسلام کے درخشاں مستقبل کا اظہار کیا گیا تھا؛ اسی میں یہ بھی فرمایا تھا :

میں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ میری، نفس مرا شعلہ بار ہوگا

رہنمائی ملت کا جو مقامِ بلند اقبال کے لیے روزِ ازل سے مقرر ہو چکا تھا یہ اس کی ابتدائی جھلک تھی۔

پی ایچ ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ وہ ولایت سے بیرسٹر بن کر آئے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کے پروفیسر مقرر ہو گئے ۔ حکومت نے انہیں کالج کے کام کے ساتھ وکالت کی بھی اجازت دے دی ۔ چونکہ وہ کالج میں مشغول ہونے کے باعث اوّل وقت میں کچہری نہ جا سکتے تھے لہٰذا ہائی کورٹ کے ججوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ ان کے مقدمات دن کے پچھلے حصّے میں پیش ہوا کریں ۔ اٹھارہ ماہ بعد انہوں نے پروفیسری چھوڑ دی اور وکالت ہی کو بطور پیشہ اختیار کر لیا (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ دوم، ص ۱۲۷) [یوں تدریس سے وہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے، اگرچہ پنجاب یونیورسٹی کی تعلیمی کمیٹیوں سے بعد میں بھی متعلق رہے]۔

اگرچہ شہرتِ عام کے باوجود اس زمانے میں انہیں وہ درجہ حاصل نہ تھا جو بعد میں انہیں ملا، بایں ہمہ ان کے قلب میں اپنے افکار کی ندرت کا احساس موجزن تھا ۔ انہوں نے خود ۱۹۰۹ء میں لکھا : جن خیالات نے میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کر رکھا ہے عوام پر ظاہر ہوں تو مجھے یقین واثق ہے کہ موت کے بعد میری پرستش ہوگی، دنیا میرے گناہوں پر پردہ ڈالے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراجِ عقیدت پیش کرے گی (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ دوم، ۱۲۶)۔

دو تین سال کی خاموشی کے بعد ان کی قومی و ملّی نظموں کا زرّیں سلسلہ پھر جاری ہو گیا ۔ ان میں سے ''شکوہ''، ''شمع اور شاعر''، ''خضرِ راہ'' اور ''طلوعِ اسلام'' انجمن حمایت اسلام کے مختلف جلسوں میں پڑھی گئیں ۔ ''جوابِ شکوہ'' موچی دروازے کے باہر ایک جلسۂ عام میں سنایا گیا ۔ ۱۹۱۵ء میں فارسی مثنوی اسرارِ خودی شائع ہوئی، جو ان کی خاص تعلیمات کا پہلا جامع اور منظم مرقّع تھی ۔ تین سال بعد رموزِ بیخودی منظرِ عام پر آئی، جسے اسرارِ خودی کا تتمّہ سمجھنا چاہیے۔

لفظ ''خودی'' سے اقبال کی مراد ''قوّتِ نفس'' اور ''رفعتِ روح'' تھی، لیکن اس کے مروّجہ مفہوم سے بعض حلقوں میں غلط فہمی پیدا ہوئی ۔ اقبال کی رائے تھی کہ جب انسان میں خوئے غلامی راسخ ہو جاتی ہے تو وہ ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتا ہے جس کا مقصد قوّتِ نفس اور رفعتِ روح ہو ۔ اسلام نفسِ انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود معیّن کرتا ہے ۔ اسی تعیّن کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانونِ الٰہی ہے ۔ خودی کا کمال یہ ہے کہ احکامِ الٰہی اس میں بہ وجہ اتم سرایت کر جائیں، یہاں تک کہ اس کے ذاتی 'امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی مقصود ہو جائے (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۲۰۱، ۲۰۲)۔

اقبال اس خودی کے داعی تھے جو سچی بےخودی، یعنی ہجرت الی الحق، کا نتیجہ ہوتی ہے ۔ حقیقی اسلامی بےخودی یہ ہے کہ انسان ذاتی میلانات اور رجحانات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جائے ۔ اس پابندی کے نتائج سے

بھی اسے کوئی غرض نہ ہو، محض تسلیم و رضا اس کا شعار بن جانا چاہیے (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۵۰، ۶۰)۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تأثرات کے زیرِ اثر ہیں ۔ انہیں عربی اسلام، اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آگاہی نہیں ۔ ان کے ادبی اور مجلسی نصب العین بھی ایرانی ہیں ۔ اقبال اس حقیقی اسلام کو بے نقاب کرنا چاہتے تھے جس کی اشاعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم نے فرمائی (مکاتیب اقبال، حصۂ اوّل، ص ۴۴۲)۔

[اقبال کے نزدیک خودی کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی ۔ خودی کے ارتقاء میں پیکار لازم ہے اور عشق کی قوتِ تسخیر کی بھی بڑی اہمیت ہے ۔ خودی قوی سے قوی تر بھی ہوتی ہے مگر سوال اور خوف جیسی بیماریاں خودی کو ضعیف بھی کرتی ہیں ۔ رموزِ بیخودی میں فرد و ملت کے رابطہ اور ملتِ اسلامیہ کی زمانی و مکانی لا انتہائیت کی بحث ہے]۔

اس کے بعد اقبال کی فارسی اور اردو نظموں کے مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے ۔ آخری مجموعہ ارمغانِ حجاز ان کی زندگی میں تیار ہو چکا تھا، لیکن وفات کے بعد چھپا ۔ ۱۹۲۹ء میں انہوں نے چھ خطبے انگریزی زبان میں لکھے تھے، جو مدراس، میسور اور حیدر آباد (دکن) میں پڑھے گئے ۔ بعد میں ایک کا اضافہ کیا۔

اقبال نے عملی سیاسیات میں بہت کم حصّہ لیا ۔ ہندوستان میں اسلام کا مستقبل انہیں پیہم مضطرب رکھتا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ دماغی اعتبار سے مسلمانوں پر وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی ۔ اسلامی تحریک کی رہنمائی کے لیے کوئی بلند منزلت شخصیت نظر نہ آتی تھی لہٰذا اس تحریک کے مستقبل کو خطرے سے خالی نہ سمجھتے تھے (مکاتیب اقبال، حصۂ اوّل، ص ۱۳۳)۔ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی تڑپ موجزن تھی، لیکن ایسی شخصیت کوئی نہ تھی جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہوتی (مکاتیب اقبال، حصۂ اوّل، ص ۲۳۹)۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان میں اسلام کے لیے نازک زمانہ آ رہا ہے ۔ حسّاس لوگوں کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن کوشش کریں (مکاتیب اقبال، حصۂ اوّل، ص ۲۴۹، ۲۵۰)۔ یہی احساس اقبال کو عملی سیاسیات میں کشاں کشاں لے آیا۔

سیاسیات میں ان کا نصب العین اسلامی مقاصد کے تحفّظ اور مسلمانوں کی بہبود کے سوا کچھ نہ تھا ۔ ان کی پختہ رائے تھی کہ جو اسلامی جماعت مسلمانوں کی بہبود کی ضامن نہ ہو عوام کے لیے باعثِ کشش نہیں ہو سکتی (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۴۱)۔ مسلم لیگ کا مستقبل بھی ان کے نزدیک اس امر پر موقوف تھا کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۵۱)۔ پنجاب کی اہمیت ان کے نزدیک بہت زیادہ تھی، اس لیے کہ یقین تھا، اسلام کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑی جائیں گی ان کی رزم گاہ پنجاب ہوگا (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۹)۔

۱۹۲۶ء کے انتخابات میں وہ پنجاب کی مجلسِ قانون ساز کے رکن بنے ۔ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد کے لیے صدر چنے گئے، جہاں انہوں نے ایک شہرۂ آفاق خطبہ پڑھا اور پاکستان کے لیے اس سر زمین میں پہلی مرتبہ صدا بلند کی ۔ گول میز کانفرنس کے آخری دو اجلاسوں میں بھی شریک رہے ۔ مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اسلامی نصب العین کے تحفّظ اور

مسلمانوں کے قومی حقوق کے حصول کے لیے انھوں نے انتہائی استقامت سے کام لیا ۔ ان کے نزدیک ہندی مسلمانوں کے کام اس وجہ سے بگڑتے رہے تھے کہ یہ قوم ہم آہنگ نہ ہو سکی تھی (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۳۹۷) ۔ اقبال کی صدارت میں مسلم کانفرنس نے مسلمانانِ ہند میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا کی جو آگے چل کر پاکستان کے نصب العین کی تکمیل کا ذریعہ بنی۔

اقبال نے اگرچہ شاعری ہی کے ذریعے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کی لیکن شاعری میں ادب محض بحیثیت ادب کبھی ان کا مطمحِ نظر نہ رہا ۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو۔ اس غرض کے لیے جن خیالات کو مفید سمجھتے تھے بہ صورت نظم ظاہر کرتے رہے۔ وہ اپنا پورا وقت بیرسٹری یا ملازمت میں بسر کرتے تو اونچے سے اونچے عہدے پر پہنچ جاتے، لیکن ملّتِ اسلام کی خدمت کے جذبے نے انھیں مال و جاہ کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا۔ ۱۹۳۳ء میں سر راس مسعود اور سیّد سلیمان ندوی کے ساتھ ترتیبِ نصاب کے سلسلے میں حکومت افغانستان کی دعوت پر براہِ خیبر کابل گئے اور براہِ غزنی و قندھار واپس آئے ۔ اسی سال دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اور اس سے اگلے سال علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو ڈی۔لٹ (D. Litt.) کی اعزازی ڈگری عطا کی۔

ء جنوری ۱۹۳۵ء کو عیدالفطر کے دن سویّاں دہی کے ساتھ کھاتے ہی زکام ہوا ۔ بہی دانہ پینے سے زکام جاتا رہا تو گلا بیٹھ گیا (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۴۱۳) ۔ علاج کے باوجود گلا صاف نہ ہوا تو ڈاکٹروں نے رائے دی کہ جو رگ حلق سے دل کی طرف جاتی ہے اس میں رسولی پیدا ہو گئی ہے، لہٰذا عملِ جرّاحی ضروری ہے یا بجلی کا علاج کرایا جائے ۔ بجلی کے علاج سے تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوا، لیکن مرض کا ازالہ نہ ہو سکا۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء ساڑھے پانچ بجے شام کو ان کی بیگم کا انتقال ہوا ۔ دو کم سن بچوں کی تربیت کی پریشانی نے صحت پر بہت برا اثر ڈالا ۔ انہیں کھانسی اور دمہ شروع ہو گیا۔ کھانسی اٹھتی تو بیہوش ہو جاتے (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۴۱۰) ۔ گلا بیٹھتے ہی وکالت ختم ہو چکی تھی ۔ والیِ بھوپال نے مئی ۱۹۳۵ء میں ان کے لیے پانسو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرّر کر دیا (مکاتیبِ اقبال، حصّۂ اوّل، ص ۳۹۲)۔

صحت کی طرف سے جب مایوسی ہو گئی تو انھوں نے بچوں کی تولیت بعض عزیزوں اور دوستوں کو سونپ دی ۔ دسمبر ۱۹۳۷ء سے بیماری زور پکڑ گئی ۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے علم و حکمتِ اسلامی کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ۔ شاہی مسجد کے بیرونی احاطے میں صدر دروازے کے قریب انہیں سپردِ خاک کیا گیا اور اس پر ایک خوب صورت مقبرہ تعمیر ہوا ۔ تعویذ حکومت افغانستان نے تین لاکھ روپے کے صرف سے تیار کرا کے بطور خراجِ عقیدت بھیجا۔

اقبال کی پوری زندگی انتہائی سادگی، خود داری اور استغناء میں بسر ہوئی: کبھی کسی سے سوال نہیں کیا، کبھی کسی کا احسان نہ لیا ۔ اس لحاظ سے وہ فقرِ غیور کا ایک نادر پیکر تھے ۔ ان کی مجلس کے دروازے سب کے لیے کھلے رہتے تھے ۔ ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، شناسا و ناشناسا کا کوئی امتیاز نہ تھا ۔ مسلمان نوجوانوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے ۔ ان کی آرزو تھی کہ اسلام کے لیے اپنی دلی تڑپ کو نوجوانوں میں منتقل کر دیں ۔ اسلام کی حقانیّت کا یقین اور ملّتِ اسلامیہ کا درد ان کی رگ و پے میں جاری و ساری تھا ۔ ان کے ہاں افکار کی جو ثروت پائی جاتی ہے اس کی مثال

اسلامی شعر و ادب میں کم ہی ملے گی۔ اقبال سے سات سو سال قبل رومی نے شرق و غرب، ایران و یونان اور اسلام و عرب کے بہترین افکار کو اپنی مثنوی اور دیوان میں منتقل کر دیا تھا۔ اس کے بعد چھے سات صدیوں میں جتنے جدید زاویہ ھائے نگاہ اور افکارِ نو پیدا ہوئے اقبال ان سے بوجہ اتم بہرہ‌مند ہوئے اور انہوں نے ایک بالغ نظر محقق کی حیثیت سے اس سرمائے سے فائدہ اٹھا کر حقیقی اسلامی زندگی کی تدوین انتہائی پُر تاثیر انداز میں اس طرح واضح کر دی کہ وہ آنے والی نسلوں کے لیے صدیوں تک روشنی کا بلند ترین مینار بنے رہیں گے۔

اقبال کے نظریۂ حیات کا خلاصہ چند سطروں میں یہ ہے:

(۱) اقبال اسلام کے سچّے معتقد اور اسلامی تہذیب کے بہت بڑے داعی تھے۔ خدا ان کے نزدیک خلّاقِ ازلی ہے۔ اس کی خلّاقی ہر لمحہ بروئے کار آتی رہتی ہے۔ زندگی سراپا خلّاقی ہے [انسان اگر اپنے مقصد سے آگاہ ہو جائے تو وہ اپنی اس خلّاقی کی جہت متعین کر سکتا ہے]۔

(۲) نوعِ انسانی کے ارتقاء کا سدرۃ المنتہٰی محمّد رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ و سلّم کی ذاتِ با برکات تھی۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی، کیونکہ زندگی کے تمام بنیادی حقائق خدا کی آخری کتاب قرآن حکیم میں محفوظ کر دیے گئے اور لامتناہی ترقّی کی راہیں کھول دی گئیں؛ ملّتِ اسلامیہ کو اجتہاد کا دروازہ بند نہ کرنا چاہیے، کیونکہ اصل زندگی اور اس کا مقصد جہادِ پیہم اور اجتہادِ مسلسل ہے۔ زندگی کے سانچے بدلتے رہیں گے لیکن قرآن نئی تشکیلِ افکار اور تعمیرِ اقدار میں ہمیشہ ہر ارتقاء پر حاوی رہے گا۔

(۳) انسان کو خارجی اور باطنی فطرت دونوں کی تسخیر سے اپنی معرفت اور قدرت میں اضافہ کرنا چاہیے۔

(۴) اقبال تہذیب اور تمدّنِ افرنگ پر شدّت سے تنقید کرتے ہیں۔ وہ یورپ کی محدود عقلیّت اور مادّیت سے بیزار ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان بھی یورپ کی طرح علوم و فنون میں ترقی کریں، لیکن مادی تمدّن میں روحانی اندازِ تفکّر و تأثّر کی آمیزش سے اسے کامل انسانیت کا آئینہ‌دار بنائیں۔

(۵) اقبال زندگی کے ہر دائرے میں صرف اسلامی نظام کی پابندی کے داعی ہیں۔

(۶) اقبال اسلام کے ارکان و شعائر کی پابندی تعمیرو تکمیلِ سیرت کے لیے لازم قرار دیتے ہیں، لیکن باطن کو ظاہر پر بہر حال ترجیح دیتے ہیں۔

(۷) اسلامی تعلیم میں غیر اسلامی تصوّف اور فرار عن الحیات کے جو عناصر داخل ہو گئے تھے اقبال مسلمانوں کو ان سے احتراز کی دعوت دیتے ہیں، لیکن وہ تصوّف کے اس صحیح جوہر کے قائل و معتقد ہیں جو رومی جیسے اکابر صوفیہ میں پایا جاتا ہے۔

(۸) فلسفیانہ حیثیت سے اقبال تخلیقی ارتقاء پسند (creative evolutionist) ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں برگساں Bergson کا ہم‌نوا سمجھنا چاہیے۔ وہ نٹشے Nietzsche کے بھی مدّاح ہیں، لیکن کہتے ہیں کہ کبریائی کا صحیح تصوّر قائم نہ کر سکنے کے باعث وہ توازن کھو بیٹھا؛ اسے کوئی مرشدِ کامل نہ ملا۔

(۹) اقبال کا خاص مضمون خودی کی معرفت اور تکمیل ہے۔ عرفانِ نفس سے عرفانِ ذاتِ الٰہی کی طرف راستہ کھلنے کا مضمون پرانا تھا؛ اقبال نے اس کی تشریح و توضیح اس انداز سے کی جو اس سے قبل کہیں نظر نہیں آتی۔

(۱۰) خودی کے علاوہ اقبال کا خاص مضمون عشق ہے، جو ان کے نزدیک ملکۂ خلّاقی ہے۔ منطقی عقل کے مقابلے میں عشق ہی حقیقی معرفت

کا سر چشمہ ہے۔ صوفیانہ حکمت و وجدان کا یہ مضمون بھی پرانا تھا؛ اقبال کے دل و دماغ اور شاعری کے کمال نے اس میں غیر معمولی وسعت، تازگی اور گہرائی پیدا کر دی۔

افکار کے لحاظ سے اقبال ملّتِ اسلامیہ کے عظیم ترین رہنماؤں میں شمار ہونے کے حق دار ہیں۔ ان کے افکار و تأثرات مسلمانوں کے شعور اور تحت الشّعور میں جا گزیں ہیں۔ انھیں جمود سے نکال کر حرّیت و تحقیق کے راستے پر ڈالنے میں جتنی کامیابی اقبال کو ہوئی ان کے معاصرین میں سے کسی مفکّر اور رہنما کو نہ ہوئی۔ ان کا اثر پاک و ہند سے نکل کر افغانستان اور ایران کے علاوہ عربی اور فرنگی دنیا تک پہنچ چکا ہے۔ وہ ان شخصیتوں میں سے ہیں جو صدیوں کے بعد فضاے انسانیت کو منور کرتی ہیں۔

تصانیف:

(۱) بانگ درا (منتخب اردو نظموں کا مجموعہ): [۱۹۲۴ء سے جون ۱۹۶۵ء تک تیئیس ایڈیشن چھپے]؛

(۲) بالِ جبریل (اردو): [جنوری ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۵ء تک چودہ مرتبہ چھپی]؛

(۳) ضربِ کلیم (اردو): جولائی ۱۹۳۶ء سے جولائی ۱۹۶۵ء تک بارہ مرتبہ چھپی؛

(۴) اسرارِ خودی (فارسی): پہلی مرتبہ ۱۹۱۵ء میں، دوسری مرتبہ ۱۹۱۹ء میں چھپی۔ اس کا منظوم اردو ترجمہ ترجمانِ اسرار کے نام سے مسٹر جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن نے اور انگریزی ترجمہ ڈاکٹر نکلسن نے شائع کیا؛

(۵) رموزِ بیخودی (فارسی): پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۱۸ء میں چھپی۔ پھر اسرار و رموز کو یکجا کر دیا گیا۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۰ء میں تیسری مرتبہ شائع ہوا [اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی ۱۹۶۴ء تک آٹھ بار چھپی]؛

(۶) پیامِ مشرق (فارسی): جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے Goethe کے "مغربی دیوان" کا جواب [۱۹۱۲ء سے ۱۹۶۳ء تک دس ایڈیشن نکلے]؛

(۷) زبورِ عجم (فارسی): مع گلشنِ راز جدید و بندگی نامہ [جون ۱۹۲۷ء سے ۱۹۵۸ء تک چھے بار چھپی]؛

(۸) جاوید نامہ (فارسی): اطالوی شاعر دانتے Dante کی *Divine Comedy* ("طربیۂ خداوندی") کا جواب [۱۹۳۲ء سے ۱۹۶۴ء تک پانچ ایڈیشن نکلے]؛

(۹) مسافر (فارسی): سفر نامۂ افغانستان، پہلی بار آرٹ پیپر پر تھوڑی سی تعداد میں چھاپی گئی؛

(۱۰) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (فارسی): یہ مثنوی پہلی مرتبہ ۱۹۳۶ء میں مع مسافر شائع ہوئی [۱۹۶۵ء تک پانچ ایڈیشن نکلے]؛

(۱۱) ارمغانِ حجاز (فارسی): اس کے ساتھ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ اور چند دیگر اردو نظمیں بھی شامل ہیں [نومبر ۱۹۳۸ء سے ۱۹۶۴ء تک آٹھ ایڈیشن شائع ہوئے]؛

(۱۲) *The Development of Metaphysics in Persia* (فلسفۂ عجم): پہلی مرتبہ لنڈن میں چھپی (۱۹۰۸ء)، دوسری مرتبہ بزمِ اقبال کے زیرِ اہتمام لاہور میں۔ اس کا اردو ترجمہ حیدر آباد (دکن) سے شائع ہوا (۱۹۳۶ء)؛

(۱۳) *The Reconstruction of Religious thought in Islam* (تشکیلِ جدیدِ الٰہیاتِ اسلامیہ): یہ چھے لیکچروں کا مجموعہ ہے۔ [پہلی مرتبہ ۱۹۳۰ء میں لاہور میں چھپا، دوسری مرتبہ ۱۹۳۴ء میں آکسفرڈ یونیورسٹی پریس میں، معمولی تبدیلیوں کے ساتھ مع ساتویں لیکچر کے، جو پہلی طباعتوں میں شامل نہ تھا، تیسری مرتبہ لاہور میں؛ اردو ترجمہ از سیّد نذیر نیازی، مطبوعۂ لاہور ۱۹۵۷ء]؛

(۴) مکاتیب کے مختلف مجموعے.

ان کے علاوہ اقبال کے متعدد انگریزی اور اردو مضامین اور کئی لیکچر مختلف رسالوں میں الگ شائع ہوے.

بعض کتابوں کے خاکے ان کے ذہن میں تھے، مثلاً:

(۱) فقہ اسلام کے متعلق مفصل کتاب بہ زبان انگریزی، جس کے لیے مصر و شام و عرب سے مواد فراہم کیا تھا (شاد اقبال، ص ۴۶ و مکاتیب اقبال، حصۂ اول، ص ۲۰۰).

(۲) رامائن کو اردو نظم کا جامہ پہنانے کا خیال (شاد اقبال، ص ۱۰۲).

(۳) ملٹن Milton کی تقلید میں لمبی نظم لکھنے کا ارادہ (مکاتیب اقبال، حصۂ اول، ص ۲۱).

(۴) قرآن حکیم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں حواشی تیار کرنے کا ارادہ؛ اس کتاب کو وہ مسلمانان عالم کے لیے اپنی بہترین پیشکش سمجھتے تھے (مکاتیب اقبال، حصۂ اول، ص ۳۰۷ و ۳۰۸ و ۳۶۱ و ۳۶۲).

(۵) کیمبرج کی تاریخ ہند (*Cambridge History of India*) کے لیے اردو ادب پر مضمون (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۴۳).

(۶) تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مقالہ (مکاتیب اقبال، حصۂ دوم، ص ۵۱ و ۵۲).

ان کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی مضامین ہیں.

مآخذ: متن میں مندرجہ کتابوں کے علاوہ (۱) اقبال کی اپنی تصانیف؛ (۲) مولوی عبدالرزاق حیدرآبادی: کلیات اقبال، حیدرآباد (دکن)، ۱۳۳۳ھ؛ (۳) انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسوں کی رودادیں؛ (۴) کشمیری میگزین کی جلدیں، بابت ۱۹۰۸ و ۱۹۰۹ء؛ (۵) شاد اقبال، مرتبۂ سید محی الدین قادری زور، حیدرآباد (دکن) ۱۹۴۲ء؛ (۶) اقبالنامہ، مرتبۂ شیخ عطاء اللہ، ۲ جلد، لاہور ۱۹۵۱ء؛ (۷) چراغ حسن حسرت: اقبالنامہ، تاج کمپنی، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۸) محمد طاہر فاروقی: سیرت اقبال، لاہور ۱۹۳۹ء؛ (۹) احمد الدین: اقبال، لاہور ۱۹۲۶ء؛ (۱۰) مقالات یوم اقبال، مرتبۂ انٹر کالجیئٹ برادرہڈ، لاہور ۱۹۳۸ء؛ (۱۱) مقالات یوم اقبال، مرتبۂ انٹر کالجیئٹ برادرہڈ، لاہور ۱۹۳۸ء؛ (۱۲) محمد الدین فوق: مشاہیر کشمیر، لاہور ۱۹۳۰ء؛ (۱۳) محمود نظامی: ملفوظات اقبال، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۱۴) یوسف حسین: روح اقبال، حیدرآباد (دکن) ۱۹۴۱ء؛ (۱۵) شیخ اکبر علی: اقبال، اس کی شاعری اور پیغام، لاہور ۱۹۳۶ء؛ (۱۶) رئیس احمد جعفری: دید و شنید، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۱۷) عارف بٹالوی: اقبال اور قرآن، کراچی ۱۹۵۰ء؛ (۱۸) عبدالرحمٰن طارق: جہان اقبال، لاہور ۱۹۴۷ء؛ (۱۹) وہی مصنف: اشارات اقبال، لاہور ۱۹۴۸ء؛ (۲۰) وہی مصنف: فردوس معانی، لاہور ۱۹۵۰ء؛ (۲۱) وہی مصنف: معارف اقبال، لاہور؛ (۲۲) وہی مصنف: روح مشرق (از ۱۷ تا ۲۲)؛ (۲۳) میر ولی الدین: رموز اقبال؛ (۲۴) بشیر مخفی: عرفان اقبال؛ (۲۵) غلام دستگیر: آثار اقبال، ۱۹۴۴ء؛ (۲۶) انیس احمد جعفری: اقبال امام ادب؛ (۲۷) سیدہ اختر: اختر و اقبال؛ (۲۸) محمد بخش مسلم: اقبال اور پاکستان؛ (۲۹) عزیز احمد: اقبال — نئی تشکیل؛ (۳۰) بشیر الحق: اصلاحات اقبال؛ (۳۱) طاہر فاروقی: بزم اقبال، آگرہ ۱۹۴۴ء؛ (۳۲) اشفاق حسین: مقام اقبال، ۱۹۴۵ء؛ (۳۳) سعید صدیق: اقبال کے خطوط جناح کے نام، [تاریخ درج نہیں]؛ (۳۴) شیر احمد خاموش: دانائے راز، ۱۹۴۰ء؛ (۳۵) ابو محمد مصلح: قرآن اور اقبال؛ (۳۶) ڈاکٹر ظہیر الدین احمد الجامعی: اقبال کی کہانی؛ (۳۷) خلیفہ عبدالحکیم: اقبال اور ملا؛ بزم اقبال، لاہور، [تاریخ درج نہیں]؛ (۳۸) وہی مصنف: رومی، نطشہ اور اقبال؛ (۳۹) عبد السلام